محمد سعید

مشرق و مغرب کی آویزشِ پیہم

مولوی محمد سعید مرحوم وطنِ عزیز کی انگریزی صحافت سے وابستہ لوگوں میں مشفق اُستاد کی حیثیت سے معروف ہیں۔ اردو ادب اور ماضی قریب کی تاریخ سے دلچسپی رکھنے والے اُن کی خود نوشت "آہنگ باز گشت" کے اسیر ہیں، اور جن افراد کو اُن سے گفتگو کرنے یا اُن کی گفتگو سننے کا موقع ملا ہے، وہ آج تک اُن کے دل نشین اندازِ بیان اور فکری پختگی کا تذکرہ کرتے ہیں۔ مولوی صاحب، کا زیرِ نظر مقالہ مطالعۂ تاریخ پر اُن کی گرفت اور مسلمانوں کی فکری روایت سے اُن کی محبت کی یادگار ہے۔ (مدیر)

مشرق و مغرب کی آویزش میرے نزدیک دو بُنیادی تقاضوں سے پیدا ہُوئی، ایک رزق کی تلاش دُوسرے خیالات کی ترویج۔ نئے تجارتی راستوں کی ٹوہ میں خلقِ خُدا پہاڑوں اور وادیوں کو مسلسل طے کرتی رہی ہے۔ مشرق سے جو لوگ تاریخ کے اوّلین دَور میں مغرب کی جانب منتقل ہُوئے وہ عرب تھے۔ جزیرہ نمائے عرب میں سے جو سامی نسل کا ایک اُبلتا ہوا کڑھاؤ رہا ہے لوگ صدی دو صدی کے بعد موج در موج اُٹھتے اور کچھ دیر کناروں پر رُکتے، پھر دُور دُور پھیل جاتے۔ یہ لوگ چونکہ تپتے ہوئے صحراؤں کے رہنے والے تھے، اِس لیے ہر سایہ دار درخت اور پانی کی ہر بُوند کے لیے مرنے مارنے پر تیار رہتے۔ عرب کی کچھ وادیوں اور پہاڑوں میں جہاں چشمے اُبلتے تھے، وہاں بستیاں اور سلطنتیں بنتی اور بگڑتی رہتی تھیں۔ قرآن مجید میں جا بجا اُن کے شواہد میں ایک جگہ کہا گیا ہے: وکانوا ینحتون من الجبال بیوتا آمنین (وہ پہاڑوں کو تراش کر بڑی خاطر جمع سے اپنے مکان بناتے۔)

ساحل سمندر پر جا کے بسنے سے یہ بدوی بڑے شاطر تاجر بن گئے تھے۔ چنانچہ اُن کے بارے میں کہا گیا ہے کہ وہ کمزور کا مال چُرا لیتے تھے۔ احمق کا مال ٹھگ لیتے تھے اور طاقتور کے ساتھ بڑی ایمانداری سے بیوپار کرتے تھے۔ ملّاح اتنے اچھے تھے کہ واسکوڈے گاما سے دو ہزار سال قبل افریقہ کے گرد گھوم کر مشرقِ بعید کے پانیوں میں تیر چکے تھے۔ یہ لوگ بحیرۂ رُوم کے مشرقی ساحل سے اُٹھے اور دور مغرب میں جا نکلے اور وہاں پہنچ کر کارتھیج نام کی ایک بستی جا بسائی۔ کارتھیج فی الواقعہ "قریہ حدث" کا بگڑا ہوا نام ہے یعنی نوشہرہ یا نیا گاؤں۔

چند صدیاں گزریں مشرق سے ایک عظیم فاتح سائرس (جو بعض علماء کے نزدیک ذوالقرنین ہے) ۵۴۶ قبل مسیح میں اُٹھا اور ایشیائے کوچک کو سرنگوں کرتا ہوا یونان کے ساحل تک آ پہنچا۔ اور یونان

کے ان شہروں کے دروازوں پر جا دستک دی جہاں یونان کے دانا عقل و خرد کی گتھیاں سُلجھایا کرتے تھے۔ یہ شہر جو یونانی تہذیب اور تمدّن کا گہوارہ تھا، فلسفہ پرور یونانیوں کے ہاتھ سے نکل کر ایران کے ایک چرواہے کے ہاتھ لگ گیا۔ ان علاقوں پر ایرانی غلبہ سائرس کی فتح سے شروع ہو کر دارائے ثالث کی شکست تک رہا۔ Xenophone زینوفون نے سائرس کے نظامِ حکومت اور سلسلۂ تعلیم پر ایک مبسوط کتاب لکھی ہے جس میں وہ لکھتا ہے کہ بہترین حکومت وہ ہوتی ہے جسے کوئی روشن دماغ شہنشاہ چلا رہا ہو۔ اور اس شہنشاہ کی پشت پر ایسے امراء ہوں جو زمینوں پر قابض ہوں اور جن کا پیشہ سپہ گری ہو اور جب بادشاہ بے راہ ہونے لگے تو وہ اسے صراطِ مستقیم پر لے آئیں۔

زینوفون سائرس کی دانائی سے اتنا مرعوب ہے کہ وہ کئی جگہ سائرس اور سُقراط کو خلط ملط کر دیتا ہے۔ اُس شہنشاہ کا اس پر اتنا اثر تھا کہ وہ ایرانیوں کے قوانین کی تعریف کرتا ہے اور یونانیوں کو مشورہ دیتا ہے کہ وہ چھوٹی چھوٹی ریاستوں کو ایک عالم گیر ریاست میں مدغم کر دیں جس میں امن اور نظم کا دور دَورہ ہو۔

مشرق کا گویا یہ پہلا پیغام تھا مغرب کے نام جو چھوٹی چھوٹی ریاستوں میں بٹ کر ہمہ وقت بر سرپیکار رہتا تھا۔

دو صدیاں اور گزریں کہ حالات نے رُخ بدلا۔ مغرب کا ایک جواں سال بادشاہ مقدونیہ کی تنگنائی سے اُٹھا، اس عزم کے ساتھ کہ پُورے عالم کو اپنی ہوسِ ملک گیری کا شکار بنائے۔ یہ سکندرِ اعظم تھا۔ جوانِ رعنا، اتنا تندرست کہ بقول پلوٹارک پسینہ سے خوشبو آتی تھی۔ دنیا میں نام پیدا کرنے کا اتنا خبط کہ باپ نے چند قلعے فتح کیے تو مارے حسد کے کہنے لگا کہ معلوم ہوتا ہے کہ یہ بوڑھا میرے کرنے کا کوئی کام نہیں چھوڑے گا۔

سکندر، اناطولیہ سے گزر کر فلسطین پہنچا، پھر مصر گیا وہاں آمون دیوتا کے استھان پر حاضری دی۔ وہاں سے فارغ ہوا تو آ کر ایران کو نذرِ آتش کر دیا۔ کچھ عرصہ باختر اور سوات میں گزار کر ہندوستان پہنچا۔ ملتان میں ملہیوں کے ہاتھوں مرتے مرتے بچا اور موصل پہنچ کر اس عالمِ فانی سے رخصت ہو گیا۔ موت سے قبل اُمراء نے جُھک کے کان میں پوچھا: "حضور! سلطنت کس کے حوالے کی جائے؟" کہنے لگا: "اُس کے جو تم میں سب سے زیادہ تلوار کا دھنی ہو گا۔"

سکندر ہومر کی ایلیڈ کا دلدادہ تھا اور اُس کی ایک جلد جس پر ارسطاطالیس کی حاشیہ آرائی تھی ہمیشہ اپنے تکیے کے نیچے رکھتا۔ علم کا بے حد شوقین، اہلِ علم کا پرستار، دن بھر کی تیغ زنی کے بعد جب شام کو اپنے خیمہ میں محفل آراستہ کرتا تو سپاہیوں کے دوش بدوش اہلِ علم بھی نظر آتے۔ ایک مرتبہ ارسطاطالیس کو لکھا۔ "اے کاش میری علمی فتوحات ملکی فتوحات سے زیادہ ہوتیں۔"

قتال و جدال کے ان تمام معرکوں کے درمیان جن سے اُس کی زندگی بھرپور تھی، ایک خاص مقصد ابھرتا ہوا دکھائی دیتا ہے۔ وہ یہ کہ بحیرہ روم کے مشرقی کناروں کی دنیا ایک وفاقی یونٹ بن جائے جس پر یونان کی پھیلتی اور پھولتی ہوئی تہذیب سایہ فگن رہے۔

مشرق و مغرب کے اتحاد و ادغام کی لگن میں اُس نے دجلہ و فرات اور ایران کی وادیوں کے دروازے یونانی نوآبادکاروں کے لیے کھول دیے۔ اس طرح یونان کے شہروں پر بڑھتی ہوئی آبادی کا دباؤ بھی کم ہو گیا۔ اور ایسے نئے شہر بھی وجود میں آ گئے جو آگے چل کر تہذیبِ یونان کے مراکز بننے والے تھے۔ اُس نے تیس ہزار ایسے ایرانی جوانوں کو منتخب کیا جنھیں یونانی تعلیم دی گئی اور یونانی فنِ حرب سکھایا گیا۔ اُس نے خود بھی مشرقی لباس زیبِ تن کیا۔ اگرچہ معاصرین نے طعنہ دیا کہ سکندر نے مشرق کے وحشیوں کی تقلید کی ہے۔ اُس کی سپاہ نے کہا، "سکندر خود مفتوح ہو گیا۔"

بعض نے کہا "ایشیا نے اپنا انتقام لے لیا ہے"، لیکن یہ سب کچھ وہ تہذیب، یونانی کی اشاعت و ترویج کے لیے کر رہا تھا۔ اُس نے ایشیا کے دروازے مغربی آبادکاروں کے لیے کھول دیے اور بحیرۂ رُوم کے مشرقی ساحل پر منڈیوں اور درس گاہوں کا ایک وسیع و عریض جال پھیلا دیا۔ وہ یونانی فلسفہ، ادب اور فنون لے کر ایشیا میں آیا اور مرنے سے پہلے اس برّاعظم کا رُخ مغرب کی جانب موڑ گیا۔

یہ مغرب کی پہلی کامیاب یورش تھی مشرق پر۔

مشہور انگریز مؤرخ ٹائن بی بھی لکھتا ہے کہ یونان ایک ہزار برس تک مشرقِ وسطیٰ کا قبلہ بنا رہا۔ لیکن یکایک ساتویں صدی عیسوی کے وسط میں عُمرؓ نے اس پورے خطّے کی سمت بدل دی اور آج تک اس کی وہی سمت ہے جو اُنھوں نے متعیّن کی تھی۔

اب تہذیبِ یونان کا پھریرا اتر چکا تھا۔ سُقراط، افلاطون اور ارسطاطالیس کی فلسفہ گاہوں پر ایک اور قوم چھا گئی تھی۔ ایک نئے فلسفے کی حیات آفرینیوں کے ساتھ یہ مشرق کی دوسری یورش تھی مغرب پر۔

اُس عرصہ میں مسیح علیہ السلام کا پیغام یورپ تک پہنچ چکا تھا۔ رومانئے مذہب کی ضیا پاشیوں کے سامنے سر بسجود ہو چکا تھا۔ سلطنت دو حصّوں میں بٹی ہوئی تھی۔ مغرب میں روما مرکزِ سلطنت تھا۔ مشرق میں قسطنطنیہ، گو مسیحیت کا اثر بڑا گہرا تھا، تاہم اُس عرصہ میں حکمرانی اُس تہذیب و تمدن کی رہی جو یونانی فلسفے سے پیدا ہوئی تھی۔ سلطنت کے کاروبار کے لیے اُن کا اپنا قانون تھا۔ گو عبادت خانے نہایت پر شکوہ و پُر جمال تعمیر ہو چکے تھے۔ پھر بھی جو غیر یوروپین قوم، اپنا خاص فلسفۂ حیات، اپنا خاص کلچر اور مخصوص تصوراتِ حرب و صلح لے کر آئی، وہ عرب تھے۔

عربستان نے اب کی مرتبہ اطراف عالم میں اپنی بہترین کھیپ بھیجی تھی۔ جو محض تجارتی راستوں

کے ہی دلدادہ نہ تھے اگرچہ ان کا ذوقِ تجارت بڑا منجھا ہوا تھا۔ اور قرآن مجید کی سورۂ قریش اس امر کی شاہد ہے۔ بلکہ وہ ایسا انقلاب انگیز پیغام لے کر اٹھے تھے جس کا محور توحید تھی۔ ہر ماسوا اللہ کے تصور سے مبرا، توحید کے ساتھ ساتھ جو ایک اور انقلاب آفرین عقیدہ اُبھرا تھا۔ وہ بزرگی انسان کا عقیدہ تھا۔ اس لیے جہاں وہ عبادت کے لیے اللہ کے سوا کسی کے سامنے گردن نہیں جھکاتے تھے، وہاں وہ ایک انسان اور دوسرے انسان میں رنگ و نسل کی تمیز روا نہیں رکھتے تھے۔

تکریمِ انسان کا یہ فلسفہ اپنے عروج کو پہنچا اُس خطبے میں، جو رسالت مآب ﷺ نے ۷ مارچ ۶۳۲ء کو میدانِ عرفات میں ارشاد فرمایا۔ آپ ﷺ نے فرمایا "نہ کسی عربی کو عجمی پر اور نہ کسی عجمی کو عربی پر فوقیت حاصل ہے۔ سب آدم کی اولاد ہیں اور آدم مٹی سے بنائے گئے تھے۔"

حضور ﷺ کا یہ مختصر سا جملہ انسان کی باطل حد بندیوں پر گرزِ گراں بن کر گرا۔ ہر طرح کی سماجی اونچ نیچ کو خود ایک عالی نسب قریش نے اپنے پاؤں تلے روند ڈالا۔ ان کے چند بھائی بند کہ جن کی نگاہیں اُس تعلیم کی متحمل نہ ہو سکیں، چلا اٹھے:

اسوداں با احمران آمیختند!

آبروئے دودمانے ریختند

"اُس نے گوروں اور کالوں کو یوں ملا جُلا دیا کہ اعلیٰ خانوادوں کی آبرو خاک میں مل گئی۔"

اُس تعلیم ہی کا نتیجہ تھا کہ حضرت عمرؓ نے ایک مرتبہ ڈانٹ کر کہا۔ "کیا تم ان کو غلام بنانا چاہتے ہو؟ حالانکہ ان کی ماؤں نے ان کو آزاد جنا ہے۔" اس سے زیادہ اور انقلاب آفرین کیا تعلیم ہو گی؟ سماجی پستی اور بلندی کا یکساں ہو جانا پہلی اور بنیادی آزادی تھی جو اسلام نے دنیا کو پیش کی، نظری اور عملی طور پر۔

الوہیتِ خداوندی اور تکریمِ آدم کا فلسفہ لے کر جب یہ قوم صحرا سے نکل کر شہروں کی جانب بڑھی تو دائیں قدم پر اُس کا تصادم ایک مشرقی تہذیب سے ہوا اور بائیں قدم پر ایک مغربی تہذیب سے۔ دونوں تہذیبیں صدیوں کے تعیش سے بانجھ ہو چکی تھیں۔ اعتقادات فرسودہ ہو چکے تھے اور عمل مفلوج، جسم عیش میں غرق، لیکن سرتاپا بے مزہ، رُوح ابہام میں گرفتار، لیکن سراسر تشنہ، ظاہری طمطراق کچھ ایسا تھا جیسے ہڈیوں کے پنجر پر لباسِ شاہانہ اوڑھا دیا گیا ہو۔ قرآن مجید نے ایسے ٹھاٹ باٹ کو "خشب مسندہ" کہا ہے یعنی ایسی لکڑیاں جو دیوار سے ٹیک لگا کر کھڑی کر دی گئی ہوں۔

اسلام اعتقادات اور عمل کی ایک نئی قوت بن کر اُٹھا تھا۔ چنانچہ دونوں سلطنتیں اُس کے سامنے آناً فاناً پیوندِ زمین ہو گئیں اور دیکھتے ہی دیکھتے یہ نظام ایک وسیع خطۂ ارض پر حاوی ہو گیا، مشرق میں انڈونیشیا کے سحر آفرین جزیروں سے لے کر جنوبی فرانس کے باصرہ نواز مرغزاروں تک۔ اس عرصہ میں

اس ملت میں خدا ترس حکمران بھی آئے اور ظالم و جابر سلاطین بھی۔ اس میں حال مست درویش بھی آئے اور مال مست امراء بھی۔ اوہام پرست جُہلاء بھی اور روشن ضمیر حکماء بھی۔ لیکن ایک بات برابر ہوتی رہی ہے کہ جب کسی خلفشار کا ظہور ہوا اندرونی طور پر، یا جارحیت ہوئی خارجی طور پر، اسلام کی قوت پنہاں اُبھر آئی اور اُس نے مسلمانوں کو بچانے کی کوشش کی۔ بقول اقبال "ہر بحران میں اسلام نے مسلمانوں کو بچایا ہے، مسلمانوں نے اسلام کو نہیں۔" تاریخ کا یہ عظیم الشان درس ہمیں بتاتا ہے کہ قوم کی بقاء بالاخر کہیں طبیب کے ہاتھ میں ہے۔

فلسفہ تکریم آدم کے اثرات محض سماجی اونچ نیچ کی تنسیخ اور آزادیٔ انسان تک ہی محدود نہیں رہے۔ ان کی کارفرمائی زندگی کے ہر میدان میں نظر آئی۔ یہاں تک کہ اُس نے ایک نئے "وار ایتھکس" (War Ethics) کی بھی بنا ڈالی۔ یہ درست ہے کہ اسلام تلوار اُٹھانے کی اجازت دیتا ہے۔ اس لیے کہ اس کے نزدیک فتنہ، قتل سے زیادہ خطرناک اور شدید ہوتا ہے، لیکن ایک ہمدرد اور محتاط سرجن کی طرح اس کا نشتر اس حد تک ہی زخم کے اندر ڈوبے گا، جس حد تک ضروری ہے۔

چنانچہ حضرت صدیق اکبرؓ کا وہ مشہور آرڈر آف دی ڈے کتب تاریخ میں محفوظ ہے جس میں اُنہوں نے لشکر کو میدان جنگ کے لیے روانہ کرتے ہوئے فرمایا، "ضعیفوں، عورتوں، بچوں اور اپاہجوں کو قتل نہ کیا جائے۔ وہ لوگ جو معبدوں میں مصروف عبادت ہوں اُنہیں قتل نہ کیا جائے۔ جو میدان جنگ سے بھاگ نکلیں اُنہیں تہ تیغ نہ کیا جائے۔ ثمردار درخت نذر آتش نہ کیے جائیں، کنوئیں ویران نہ کیے جائیں۔"

جان اور مال کی حفاظت اور عبادت کی یہ آزادی اور وہ بھی دشمن کے لیے، عین عالم جنگ میں، بغیر نسل اور رنگ کی تمیز کے! آزادی کا اس سے زیادہ اچھوتا اور اونچا تصور کہاں ملے گا؟

ایک اور مشہور واقعہ ہے کہ حضرت علی کرم اللہ وجہہ ایک کافر کا کام تمام کرنے ہی والے ہیں کہ اُس نے آپ کے مُنہ پر تھوک دیا۔ آپ نے ہاتھ روک لیا اور اُسے آزاد کر دیا۔ اُس کافر کو تو حضرتؓ نے آزاد کیا ہی تھا۔ لیکن ساتھ ہی اپنے آپ کو اپنے نفس کا غلام ہونے سے بچا لیا۔ تصوف کی تمام پابندیاں اور آزادیاں یہیں سے پھوٹیں۔

ان مثالوں سے بھی ارفع و اعلیٰ وہ مثال ہے جو حضور ﷺ نے قائم کی۔ مکہ کے وہ بُت پرست قریش جنہوں نے حضور کو ہر درد ناک اذیت پہنچائی۔ اُن کے گُنبے تک کو وحشت و بربریت کا ہدف بنایا اور بالاخر جب ظالم خود مفلوج و مفتوح ہو گئے اور اپنے بُرے اعمال ایک ایک کر کے اُن کی نگاہوں کے سامنے آ گئے اور انجام سے خود خوف زدہ ہونے لگے تو حضور نے ان کی تشفی یہ کہہ کر فرما دی۔ "لاتثریب علیکم الیوم" آج تم پر کوئی سزا نہیں۔" بلکہ یہاں تک کہہ دیا کہ جو ابوسفیان کے گھر پناہ لے لے وہ بھی امان میں ہے اور جو ابوحکیم کے گھر چلا جائے، اُس کی زندگی اور مال بھی محفوظ و آزاد ہے،

حالانکہ خود ابو حکیم مکّے سے فرار ہو چکا تھا۔

ذرا آج کی مہذّب دنیا پر نگاہ ڈالیے، ابھی نسلی امتیاز سے بھی آزاد نہیں ہوئی۔ ہندوستان کے مندر ہوں یا منڈیاں، امریکہ کے کارخانے ہوں یا ایوانِ ہائے تجارت، برطانیہ کی درس گاہیں ہوں یا کوچہ و بازار، جنوبی افریقہ کی عبادت گاہیں ہوں یا سونے کی کانیں، کہیں دنیا غیر برہمنوں کے لیے جہنم زار ہے اور کہیں سیاہ فام حبشیوں کے لیے۔ نہ مذہب آزاد ہے نہ رنگ۔

اس فلسفۂ حیات کی بدولت اسلام، مغرب کے دور دراز گوشوں تک پھیل گیا۔ اور پانچ سو برس تک اسپین کی وادیوں میں اذانیں گونجتی رہیں، لیکن رفتہ رفتہ وہ پودا جس کی کاشت عبدالرحمن اموی نے کی تھی، مرجھا گیا اور مغربی قوتوں کی پے در پے آندھیوں نے اُس کی راکھ تک اُڑا دی۔

اس سانحہ کے دس برس کے اندر اندر مغربی اقوام نے تہیّہ کر لیا کہ اب مشرق سے نپٹنا ہے۔ چنانچہ ۲۶ نومبر ۱۰۹۵ء کو پوپ اربن نے پُوری مغربی دنیا سے اپیل کی کہ وہ سرزمین مسیح کے تقدّس کی حفاظت کے لیے اُٹھ کھڑے ہوں۔ ۱۰۹۷ء میں ڈیڑھ لاکھ آدمی قسطنطنیہ کے بالڈون کی قیادت میں جمع ہو گئے۔ وہ اس جمِّ غفیر کو لے کر جون ۱۰۹۷ء میں اناطولیہ کی سرزمین سے گزرا اور ترکیہ کے شہر اسکی کو فتح کرنے کے بعد ارمنی عیسائیوں کی مشرقی بستی میں پہنچ گیا اور الروحہ کے مقام پر اُس نے پہلی لاطینی ریاست قائم کر دی۔ اُس کی فوج کا بڑا حصّہ انطاکیہ کی جانب بڑھ گیا۔ ۱۰۹۸ء میں شمالی شام کا یہ صدر مقام فتح ہو کر لاطینی معرکہ بازوں کے قبضے میں چلا گیا۔ سلجوقیوں کی فوج قریب قریب تباہ ہو گئی۔ بالڈون کا بھائی گاڈفرے بھی معرکہ میں شامل ہو گیا اور جب اُس نے دیکھا کہ رملہ خالی ہے تو اُس نے بڑھ کر اس پر قبضہ کر لیا اور ۷ جون ۱۰۹۹ء کو مغربی افواج یروشلم کی دیواروں تلے پہنچ گئیں اور یوں الروحہ اور رملہ کے علاوہ تیسری لاطینی ریاست قائم ہو گئی۔ گاڈفرے نے لاطینی تاجروں کو دعوت دی کہ وہ ان علاقوں پر چھا جائیں۔ وہ صدیوں سے تجارت کے راستے کے مسدُود ہو جانے سے گھٹن محسوس کر رہے تھے۔ چنانچہ وہ یورپ کے شہروں سے (بالخصوص وینس سے) ٹڈی دل کی طرح اُٹھے اور حیفہ، عکّہ اور جافہ کی منڈیوں پر چھا گئے۔ کچھ عرصہ بعد ترپولی بھی فتح ہو گیا اور بحیرۂ روم کے مشرقی ساحل پر چار لاطینی ریاستیں وجود میں آ گئیں۔ ڈاکٹر فلپ ہٹّی کے الفاظ میں A small Christian territory was set against a vast and dark background of Islam. (ایک چھوٹی سی عیسائی مملکت اسلام کے وسیع اور اندھیارے پس منظر میں قائم ہو گئی۔)

۱۱۲۷ء میں عطا بیگ امام الدین زنگی اِس معرکہ میں کُود پڑا۔ زنگی ایک ترک غلام کا بیٹا تھا۔ اُس نے جب حلب میں اپنے لیے ایک چھوٹی سی ریاست بنائی تو اُس کی پہلی زد روحہ پر پڑی۔ چونکہ روحہ کی بستی بغداد کے قریب تھی اور اِس شاہراہ کو یہیں پیچ کاٹتی تھی جو بغداد کو دمشق سے ملاتی تھی اور

عراق کی پوری تجارت پر چھائی ہوئی تھی۔ اس لیے زنگی نے اس اہم مقام کو اپنا نشانہ بنایا۔ یہ مغرب کے اثر و نفوذ کی آخری حد تھی۔ محاصرہ اس قدر کامیاب تھا کہ اُس بستی نے چار ہفتوں میں ہتھیار ڈال دیے۔ یہ ریاست صلیبی جنگوں کے دوران وجود میں بھی سب سے پہلے آئی تھی اور مٹی بھی سب سے پہلے۔ اس ایک بستی کے مفتوح ہونے نے تمام یورپ میں تہلکہ مچا دیا۔ چنانچہ دوسری صلیبی جنگ کی داغ بیل پڑ گئی۔ جرمنی اور فرانس کے شہزادوں نے دمشق کا محاصرہ کر لیا، لیکن یہ معرکہ بے نتیجہ رہا۔

امام الدّین کے بعد حلب میں نور الدین زنگی تخت نشین ہوا۔ اُس نے دمشق چھین لیا اور یوں اپنے لیے یروشلم تک راستہ صاف کر لیا، تاہم فلسطین میں مسلمانوں کا ستارہ ہنوز گردش میں تھا۔ عسقلان جو نصف صدی سے فرنگیوں کا راستہ روکے ہوئے تھا مفتوح ہو گیا۔ مسلمانوں کی اس شکست نے مغربی اقوام کے لیے مصر تک کی راہ کھول دی اور دو مزید صدیوں کے لیے قسطنطنیہ اسلامی عساکر کی یلغاروں سے محفوظ ہو گیا۔

مصر میں فاطمی کمزور ہو چکے تھے۔ شیر کوہ منصب وزارت پر فائز تھا۔ جب اُس کا انتقال ہوا تو اُس کا بھتیجا صلاح الدین ابن ایوب عروج میں آ گیا۔ اُس نے خلیفہ بغداد کے نام کا خطبہ پڑھوایا۔ تمام معرکہ اتنا پُرامن رہا کہ ایک تاریخ دان کے مطابق "دو بکریوں کے سینگ تک بھی آپس میں نہ ٹکرائے۔"

۱۱۷۴ء میں نور الدین زنگی کی وفات پر صلاح الدین نے خود مختاری کا اعلان کر دیا اور شام پر بھی قابض ہو گیا۔ ۱۱۸۸ء میں حطّین کی جنگ کے بعد اُس نے نہ صرف فرنگیوں کو شکست دی، بلکہ ۲ اکتوبر کو یروشلم بھی فتح کر لیا۔ قیدیوں کے ہجوم میں فرنگی بادشاہ بھی تھا۔ یروشلم فتح ہوا تو مشرقی ساحل پر سے لاطینی سلطنتیں حرف غلط کی طرح مٹ گئیں۔ اس فتح نے یورپ کے تن بدن میں آگ لگا دی اور تیسرے معرکہ صلیبی جنگوں کی بنیاد رکھ دی۔

جرمنی کے فریڈرک، انگلستان کے رچرڈ اور فرانس کے فلپس آگسٹس یورپ سے اپنے اپنے لاؤ لشکر لے کر چلے۔ فریڈرک راستے میں سسلی کے ایک دریا میں ڈوب گیا۔ رچرڈ قبرص کو بھی فتح کرتا آیا تاکہ میدان جنگ کے قریب ہی ایک محفوظ مقام رسد و رسائل اور پناہ کے لیے میسر رہے۔ جنگی فراست میں رچرڈ کو داد دنیا پڑتی ہے کہ اُس نے دیکھ لیا تھا کہ فلسطین کی مہم کے لیے قبرص کتنا ضروری ہے۔

جب فرنگی طاقتیں اس اہتمام اور جمعیت کے باوجود یروشلم نہ لے سکیں، تو رچرڈ نے خالص انگریزی ذہنیت کا ثبوت دیا اور ایک فارمولا پیش کیا کہ صلاح الدین کے بھتیجے ملک العادل کے بیٹے کو رچرڈ کی ہمشیرہ بیاہ دی جائے اور دونوں کو یروشلم تحفتہً دے دیا جائے۔

صلاح الدین کے مقابلے میں یورپی اقوام کے پاس منجنیقیں اور دوسرا سامانِ حرب اچھا تھا، لیکن صلاح الدین کے بعد یروشلم پھر فرنگیوں کے قبضہ میں چلا گیا۔

۱۲۲۲ء تک فرنگی طاقتوں نے سمجھ لیا تھا کہ اب اسلامی قوت شام سے مصر میں منتقل ہو گئی ہے

اور صرف مصر پر قبضہ کرنے ہی سے وہ بحیرۂ احمر اور اُس کے پار بحرِ ہند میں جہاز رانی کر سکیں گے۔ دو سال کی جدوجہد کے بعد اُنہیں الکامل نے نکال دیا۔

۱۲۴۴ء میں نجم الدین ایوبی نے پھر یروشلم پر قبضہ کر لیا۔ نجم الدین مرض الموت میں مبتلا تھا، جب اُسے پتہ چلا کہ دمیاط مسلمانوں کے ہاتھوں سے نکلا جا رہا ہے۔ فرانس کے بادشاہ لوئی نہم نے ۶ جون ۱۲۴۹ء کو دمیاط پر قبضہ کر لیا۔ فرانس قاہرہ پر چڑھ دوڑا۔ لیکن اُس کی فوج سیلابِ نیل کی نذر ہو گئی۔ لوئی اور اُس کے ساتھی قید ہو گئے۔ ایک ماہ کے بعد رہا ہوئے۔ مفتوح علاقہ واپس کر دیا گیا، تاہم مغربی اقوام کو آخری ضرب لگانا سلاطینِ مملوک کی قسمت میں تھا۔

اِن معرکوں سے ایک فائدہ ہوا۔ مسلمانوں کے خلاف جو بے بنیاد الزامات تھے۔ اُن میں سے بہت سوں کا ازالہ ہو گیا۔ یہی نہیں بلکہ یورپ نے بڑا گہرا اثر قبول کیا۔ دنیائے فکر میں جو انقلاب غرناطہ اور قرطبہ کی درسگاہوں نے پیدا کیا تھا، اُس سے کم تر وہ انقلاب نہیں تھا جس کی بنیادیں فلسطین اور شام کی جنگ گاہوں میں پڑیں۔ سائنٹیفک نقطۂ نظر کہ جس کی مرہون دورِ حاضر کی فلک شگاف سائنس ہے اُس دور میں استوار ہوئی، یورپ کی نگاہوں میں ایک بے پناہ وُسعت پیدا ہو گئی۔ لیکن بد قسمتی ملاحظہ کیجیے کہ چشمِ زلیخا روشن کرنے کے بعد دیدۂ یعقوب خود بے نور ہو گیا۔

مسلمانوں پر رفتہ رفتہ فکری فالج گرنے لگا۔ یورپ کے بجھے ہوئے چراغ ایک ایک کر کے دمک اُٹھے اور یہاں کی دیپ مالا کو تعیش، جمود اور اوہام پرستی کے اندھیرے نِگل گئے۔ یورپ اوہام سے نکل کر سائنس کی دنیا میں آ گیا۔ پاپائیت کے جال سے نکل کر تسخیرِ فطرت پر کمر بستہ ہو گیا۔ شہنشاہوں، نوابوں اور زمین داروں کو ختم کر کے دولت کی پیداوار اور تقسیم کے لیے نئے اسلوب سوچنے لگا۔ مشین کا راج ہو گیا، تا آنکہ اٹھارویں صدی کے آخر پر مسلمان انتہائی پستی میں گر گئے۔ فکری طور پر مفلوج، سیاسی طور پر تشدد کا شکار اور عسکری اعتبار سے ہر معرکہ میں مغلوب، اگرچہ کہیں کہیں چھینی ہوئی آزادی کے لیے جانبازانہ لڑے۔ لیکن ۱۷۹۹ء میں جب ہندوستان میں ٹیپو کو شکست ہوئی اور ترکی میں عبدالحمید کا بحری بیڑہ غرق ہو گیا تو کوئی ایسا گوشہ نہ رہا جس پر تاریکی نہ چھا گئی ہو۔

عسکری یلغاروں کے ساتھ یورپ اپنی فکری جنگ بھی بڑی چابکدستی سے لڑ رہا تھا۔ وہ فکر بے باک کے ساتھ ساتھ تجارت کے نئے اسلوب اور سیاست کے نئے ہتھکنڈے لے کر آیا۔ اس نے بقول اقبال، تختہ دوکان کو تخت و تاج کا شریک بنا لیا۔ تجارت کرتا تو "وقت سودا خند خند"، سیاست لڑاتا تو "لاتے ہیں سرور اوّل دیتے ہیں شراب آخر"

شام اور ہندوستان میں نئی تعلیم کا چرچا ہوا۔ ۱۸۳۴ء کا سال نیا موڑ ثابت ہوا۔ مالٹا کا چھاپہ خانہ بیروت پہنچا دیا گیا۔ دھڑا دھڑ نئی کتابیں درسگاہوں میں پھیلنے لگیں۔ وزیرِ اعظم پامرسٹن نے ڈاکٹر جان

براؤننگ کو ۱۸۳۸ء میں شام میں بھیجا یہ دیکھنے کے لیے کہ نئے خیالات دل و دماغ میں کہاں تک اُتر گئے ہیں۔ اِس سے کچھ عرصہ قبل لارڈ میکالے ہندوستان میں وہ مشہور نوٹ لکھ چکا تھا جو یہاں انگریزی تعلیم کا سنگ بنیاد بنا۔ اِس کے بعد ترکی پر برابر دباؤ پڑتا گیا۔ شام ایک حملہ کی گرفت میں تھا۔ اِس نیم برّاعظم میں ۱۸۵۷ء میں حصولِ آزادی کی اوّلین کوشش ہوئی۔ لیکن بے نتیجہ رہی بلکہ صبح فرغان شام رنگون میں بدل کے رہ گئی۔ اِس سے قبل ۱۸۲۰ء میں عبدالقادر الجیریا میں اور سیّد احمد شہید ہندوستان میں مصروفِ جہاد تھے۔ صدی کے آخری دھائے میں سوڈان میں مہدی اُٹھے، لیکن یورپ کی فکری اور عسکری گرفت ہر آن سخت ہوتی گئی۔ نیا لٹریچر چھپتا گیا۔ خفیہ انجمنیں بنتی گئیں، حتیٰ کہ ۱۸۸۰ء میں بیروت سے برٹش کونسل نے بڑی مسرت سے لندن تار بھیجا۔

بیروت کی دیواروں پر انقلابی پوسٹر نمودار ہو گئے ہیں، گمان غالب ہے کہ یہ مدحت کی تحریر ہے۔ بہرحال (شہر میں) امن و امان ہے، تفصیلات اگلی ڈاک سے۔

عالمِ اسلام کے اس تشتّت اور افتراق کے پھیلنے کے خلاف بالآخر ایک دل ہلا دینے والی آواز اُٹھی، وہ آواز جمال الدین افغانی کی تھی۔ لیکن مغربی استعمار نے اُسے بھی کہیں چین نہ لینے دیا اور عالمِ اسلام کو ایک وحدت میں سمو دینے کا منصوبہ جہاد کی طرح ہر کوچہ و بازار میں رسوا کر دیا گیا۔

عرب اور ترکوں نے علیٰحدہ علیٰحدہ رستے اختیار کر لیے، حتیٰ کہ عبداللہ اور اُن کے والد شریف حسین نے بڑی سادگی سے انگریزوں کو اپنا آقا کار سمجھا، لیکن خود حسبِ معمول انگریزی سیاست کا شکار ہو گئے۔ مشرقِ وسطیٰ کو جال میں پھانسنے ہندوستان سے سرہنری میکونین اور سوڈان سے سر ریجنالڈ ون گیٹ مصر پہنچا۔ نتیجہ لارنس اور ایلن بی کی صورت میں نکلا۔ مشرقِ وسطیٰ میں ہر جگہ یونین جیک لہرانے لگا۔ شریف حسین مایوس ہو کر اِس دنیا سے گئے۔ مرنے سے قبل کہا لائڈ جارج لومڑی کی طرح چالاک اور مداریوں کی طرح شعبدہ باز ہے۔

جب تک شریف حسین سے خفیہ نامہ و پیام چلتے رہے یہودی ریاست کا کہیں بھی نام نہ آیا۔ جب جنگ جیت لی گئی تو چرچل اور دیگر دانشوروں نے اِن تحریروں کی حسبِ معمول وہ تاویلیں شروع کر دیں کہ عرب دماغ چکرا کر رہ گیا۔ اور آج دنیائے عرب ایک ایسے دشمن سے نبرد آزما ہے جس کا وجود بھی اِس کے وہم و گمان میں نہ تھا اور جسے مغربی استعمار کے کسی شعبدہ باز نے ان ہونے سے ہونا کر دیا۔

اِس اثناء میں ایک اور جنگ آئی اور انگریز کے تاروپور کو تہ و بالا کر گئی، وہ ہندوستان چھوڑ گیا۔ فرانس مضمحل ہو گیا، وہ مشرقِ بعید اور شمالی افریقہ سے نکل گیا۔ ولندیزی انڈونیشیا سے رخصت ہو گئے۔ لیکن ایک پنجابی محاورہ کے مطابق ڈائن چلی تو گئی لیکن اپنے دانت طاقچے میں رکھتی گئی، یہ طاقچہ اسرائیل ہے۔

مغربی استعمار کے اُس آقا لقب زنی کا ہم صحیح جائزہ لیں تو زمان اور مکان کے اعتبار سے ہم اُس

مقام پر پہنچتے ہیں جہاں پروفیسر ہنٹی کہتا ہے۔

صحیح طور پر جائزہ لیا جائے تو صلیبی جنگیں مشرق و مغرب کے درمیان آویزش کی اس طویل داستان کا وسطی باب معلوم ہوتی ہیں جو قدیم زمانے میں ٹرائے اور ایرانیوں کی لڑائی سے شروع ہوئی اور جس کا آخری باب یورپ کی توسیع پسندی ہے۔

مغربی استعمار پچھلی رُبع صدی میں زمینی اعتبار سے یقیناً بہت سکڑ گیا ہے، لیکن اس کا فکری پھیلاؤ ہر آن بڑھ رہا ہے۔ جن قوموں کو سیاسی آزادی میسر آ بھی گئی ہے، اُن کے بھی ایامِ غلامی ختم نہیں ہوئے۔ مغرب کی سیاست کے بیچ میں جبہ و دستار اور جام و مینا یکساں ہے۔ ہر آزادی پر گاہ کی طرح لرزاں ہے اور یونہی رہے گی، جب تک اس کی حفاظت نہ کی جائے گی۔ فرانسس بیکن نے کہا ہے کہ "آزادی کی قیمت اُس کی انتھک نگہداشت ہے۔" یہ نگہداشت گھر کے اندر اور باہر، روح کی گہرائیوں میں اور جسم کی گہرائیوں میں ہر جگہ ہونی چاہیے۔ جس ملک کے عوام یا حکومت کو اپنے آزاد ہونے کا احساس نہیں یا وہ آزاد رہنے سے محروم ہیں، وہ آزاد نہیں، آزاد ملک میں مردانِ حُر کی طرح جینا ہوگا۔ اگر یہاں کے تاجر بدستور ہوس کے غلام ہیں، یہاں کے زمیندار خاندانی تفاخر کے پرستار ہیں۔ یہاں کے حکمران عوام سے دور اور عوام اپنے آپ کو اُن کی دنیا میں مجبور اور محروم سمجھتے ہیں، تو آزادی مفقود رہے گی۔ آزادی اعلان نہیں ہوتا عمل ہوتا ہے۔

جس قوم کی فکری قیادت دوسروں کے ہاتھ میں ہو یا جس کے جسم کی پرورش یا حفاظت اغیار کا فرض بن جائے وہ قوم انسانوں کا بے ہنگام گلّہ ہے۔ حفاظتِ آزادی آپ کا اپنا فرض ہونا چاہیے۔ اقوامِ متحدہ کے وجود سے مجھے بالکل انکار نہیں۔ اس کے ایوانوں میں واویلا بجا۔ وہاں کی رونقوں کو بڑھانے میں کوئی حرج نہیں۔ وہاں جا کے چھوٹوں کی بڑی باتیں سنیے اور بڑوں کے چھوٹے کردار ملاحظہ کیجیے، لیکن میں نے جب بھی وہاں کے دانشوروں کی کارگزاری پر غور کیا ہے تو جی چاہا کہ اس کے ایوانِ عالی کی پیشانی پر یہ لکھدوں۔

ولاتكونو كالتى نقضت غزلها من بعد قوة انكاثا

(اُس بڑھیا کی طرح مت ہو جاؤ جو بڑے انہماک اور محنت سے سُوت کاتتی ہے، اور خود ہی اُسے ٹکڑے ٹکڑے کر دیتی ہے۔)

آزادی کی حفاظت کے لیے فکر میں صحیح انقلاب پیدا کرنا ہوگا اور جسم کو سخت ریاضت کا عادی بنانا ہوگا، جب جا کے کہیں آزادی کی نگہداشت ہو سکے گی۔